تبصرہ و تعارف

عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خاں

مرتب: پروفیسر شہزاد انجم
صفحات: ۷۸۴، قیمت: ۴۴۸/روپے
ناشر: پروفیسر شہزاد انجم

زیر تبصرہ کتاب ''عہد ساز شخصیت: سرسید احمد خاں'' پروفیسر شہزاد انجم کی ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کی کئی کتابیں شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہوچکی ہیں، جن میں دیدہ ور نقاد: گوپی چند نارنگ، آزادی کے بعد اردو شاعری، اظہر عنایتی ایک سخنور، احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات، تنقیدی جہات، دیوان شیدا وغیرہ اہم ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے رشحات قلم کے ذریعے مختلف شخصیات پر کئی مونوگراف بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ان دنوں پروفیسر شہزاد انجم شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بحیثیت صدر اپنے فرائض انجام دینے میں مشغول ہیں۔

پروفیسر شہزاد انجم کے ذریعہ پیش کردہ کتاب دراصل سرسید سے ان کی انسیت و محبت کا ثمرہ ہے۔ یوں تو سرسید پر متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کی جاچکی ہیں، لیکن امکانات کے دراب بھی وا ہیں۔ مرتب کی یہ کتاب چار برس کی سخت محنت کا نتیجہ ہے۔ کتاب کی ترتیب کے دوران مرتب نے دہلی اور بیرون دہلی کے اسفار کے علاوہ کئی اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں، جس کا حاصل یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ بے پناہ مخالفت کے باوجود سرسید نے ملک و قوم کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان تمام پہلوؤں یا موضوعات کو پروفیسر شہزاد انجم نے مذکورہ کتاب میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے متعلق سب سے پہلے یہ عرض کردوں کہ مرتب نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب نثر اور دوسرا نظم کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ سرسید احمد خاں کی شخصیت، سیرت، تصانیف، افکار، خیالات اور نظریات وغیرہ کو زیادہ واضح اور منظم انداز میں سمجھنے کے لیے مرتب نے نثری حصے کو چھ ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، جو بالترتیب (۱) سرسید احمد خاں: سوانح اور شخصیت (۲) علمی ادبی اور دینی خدمات (۳) افکار و نظریات (۴) سرسید احمد خاں اور علی گڑھ (۵) تعلیم، تاریخ، تہذیب، ثقافت (۶) سرسید احمد خاں کی معنویت اور ضرورت، ہیں۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت مضامین کے انتخاب سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کتاب گڈمڈ یا گنجلک ہونے سے بچ گئی۔ زیر تبصرہ کتاب میں مندرجہ بالا ذیلی عنوانات کے تحت کل پچاس مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر مضامین اپنی معنویت اور اہمیت کے اعتبار سے مکمل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'سرسید: ایک تعارف' اور 'سرسید کے افکار' (خلیق احمد نظامی)، 'سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر' (علامہ شبلی نعمانی)، سرسید اور علی گڑھ (رشید احمد صدیقی)، سرسید بحیثیت مؤرخ (ڈاکٹر خلیق انجم) اور سرسید کی معنویت موجودہ دور میں (پروفیسر محمد مجیب) وغیرہ ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ یعنی بابِ نظم اُن منتخب نظموں پر مشتمل ہے جن کے ذریعے شعرا نے سرسید کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج پیش کیا ہے۔ ان میں نذیر احمد، الطاف حسین حالی، محمد علی جوہر، اکبر الٰہ آبادی، سلیم پانی پتی، ظفر علی خاں، سبحان اللہ علامہ کیفی چڑیا کوٹی، اظہر عنایتی اور ڈاکٹر معظم علی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں مثالوں کی گنجائش نہیں اس لیے ڈاکٹر معظم علی کے فقط ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں:

بظاہر تندرستی میں کوئی ثانی نہ تھا ان کا
مگر تھے قوم کے غم میں بہت بیمار سرسید

کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں چونتیس صفحات پر مشتمل ایک مبسوط اور جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں سرسید کی زندگی، ان کی تصانیف مثلاً جام جم (۱۸۴۰)، آثار الصنادید (۱۸۴۷)، سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲)، آئین اکبری (۵۶-۱۸۵۵)، تاریخ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸)، اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹) اور تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲) وغیرہ پر مختصر اور جامع گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مرتب نے خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیات جاوید' بالخصوص اس کے دیباچے پر تنقیدی انداز میں اپنا موقف بھی بیان کیا ہے۔ مرتب نے اس بات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کہیں نہ کہیں سرسید کے خواب کی ایک تعبیر ہے، کیوں کہ سرسید نے ''اینگلو اورینٹل کالج'' یا ''مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند'' کے ذریعے طالب علموں کی جس انداز میں ذہنی تربیت کی تھی وہی مستقبل میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا سبب بنا۔

مختصر یہ کہ منتخب شدہ مضامین، نظمیں اور مبسوط و جامع مقدمہ کے ساتھ کتاب کی ترتیب و تزئین کو دیکھتے ہوئے مبصر کو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ پروفیسر شہزاد انجم کی یہ کاوش جز میں کل کو سمونے کی کامیاب کوشش ہے۔ کتاب دیدہ زیب اور قیمت بھی مناسب ہے۔ کتاب کی اشاعت پر پروفیسر شہزاد انجم صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب اردو کے طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرز کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ کتاب کے مشمولات کے پیش نظر اس کی بھی قوی امید ہے کہ

سرسید کو سمجھنے یا ان پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے مذکورہ کتاب حوالہ جاتی حیثیت اختیار کرے گی۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شبلی نعمانی-بحیثیت ادیب اور نقاد

مصنف: پروفیسر الطاف احمد اعظمی
صفحات: ۱۸۰، قیمت: ۳۰۰/روپے
ناشر: روز ورڈ بکس، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

علامہ شبلی نعمانی اردو زبان و ادب اور شعریات کے حوالے سے اپنی خصوصی شناخت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شبلی نعمانی شعر و ادب اور تاریخ و تنقید کا بڑا معتبر حوالہ ہیں۔ پیش نظر کتاب 'شبلی نعمانی- بحیثیت ادیب و نقاد' پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی تصنیف ہے۔ الطاف اعظمی تحقیق و تنقید کی کئی قابل ذکر کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں 'اسلامی عبادات- ایک تحقیقی مطالعہ'، 'اسلامی ریاست'، 'احیائے ملت اور دینی جماعتیں'، 'وحدت الوجود- ایک غیر اسلامی نظریہ'، 'خطبات اقبال- ایک مطالعہ'، 'اقبال کے بنیادی افکار' اور 'تفسیر میزان القرآن (تین جلدیں) نہایت قابل مطالعہ اور قیمتی کتابیں ہیں۔ ان کی تازہ کتاب 'شبلی نعمانی- بحیثیت ادیب اور نقاد' مطالعات شبلی میں ایک قابل تحسین اضافہ ہے۔ پروفیسر الطاف اعظمی جب کسی موضوع کا تحقیق و تنقید کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے نئے طرز اور نئے مضامین کو زیر بحث لاتے ہیں اور اپنے اندازِ تحریر سے فصاحت و بلاغت اور صفائی و برجستگی کے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن کو پڑھ کر بے ساختہ دل سے تعریف نکلتی ہے۔

اس کتاب میں شبلی کی اردو شاعری، شبلی کی فارسی شاعری، شبلی کی دو اہم ادبی تصانیف: موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم پر نہ صرف عالمانہ گفتگو کی ہے، بلکہ بعض ان مباحث پر بھی روشنی ڈالی ہے، جن پر ابھی تک تفصیلی گفتگو سامنے نہیں آئی تھی۔ پروفیسر الطاف اعظمی نے اصول تقابل کے تحت لکھا ہے ''موازنہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے دو مرثیہ گو شاعروں کے درمیان تقابل کے لیے جو اصول مقرر کیا وہ فصاحت و بلاغت ہے۔ شبلی سے پہلے بھی یہ دونوں اصطلاحیں اردو ادب میں مستعمل تھیں، لیکن ان کا تصور دھندلا اور ان کے ادبی و شعری اطلاقات میں بے اعتدالی پائی جاتی تھی۔ شبلی نے پہلی بار ان دونوں اصطلاحوں کو وسیع تناظر میں ایک فیصلہ کن تنقیدی معیار عطا کیا۔''

شبلی نے اندازِ تقابل ایسا اختیار کیا ہے کہ اس میں بھی ایک خاص تناسب اور توازن قائم ہے۔ انھوں نے الفاظ کے دروبست پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگل اور صحرا کا استعمال کہاں درست ہے اور اوس اور شبنم کا استعمال کہاں بہتر ہے۔ محلِ استعمال کا یہ طریقہ فصاحت سے گہرا تعلق رکھتا ہے جس کو پروفیسر الطاف اعظمی نے اپنے طرز تحریر سے دو آتشہ بنا دیا ہے۔

پروفیسر الطاف اعظمی کے مطابق شبلی کے عہد میں تنقید کی دنیا میں جس نوع کے ادبی و تنقیدی مباحث مروّج و مقبول تھے، ان میں ماہیّت شعر، شاعری کے عناصر ترکیبی، تخئیل و محاکات، تشبیہ و استعارہ، لفظ و معنی میں رشتہ، فصاحت و بلاغت اور شاعری کی غرض و غایت جیسے امور بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان تنقیدی مباحث کے متعلق علامہ شبلی نے مشرقی اور مغربی ادب کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی ادبی و تنقیدی اہمیت کے حامل ہیں۔

یقین ہے ان کی یہ کتاب ان کی دوسری کتابوں کی طرح نہ صرف پسند کی جائے گی، بلکہ ایک استناد کا درجہ بھی حاصل کرے گی۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر منور حسن کمال
N-93، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025
موبائل: 9818649521

چمرا سُر (ناول)

مصنف: شموئل احمد
صفحات: ۸۸، قیمت: ۱۲۵/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

''چمرا سُر' شموئل احمد کا چوتھا ناول ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین ناول 'ندی'، 'مہاماری' اور 'گرداب' مقبول ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر ان کے ناول ندی کی شہرت کی گونج آج بھی ادبی حلقوں میں موجود ہے۔ شموئل احمد کا یہ نیا ناول بھی ان کے معروف ادبی رنگ و اسلوب کا مظہر ہے۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات، خاص طور پر ناول تین واضح رجحانات سیاست، نفسیات اور جنسیات سے تشکیل پاتی ہیں جنھیں وہ اپنے مخصوص انداز بیان سے دلچسپ اور مؤثر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ زیر تبصرہ ناول بھی انہی عناصر سے گوندھا گیا ہے البتہ اس میں 'ندی' کے مقابل میں سیاسی عنصر کی مقدار زیادہ ہے۔ غالباً ندی ان کا والد ناول ہے جس میں 'سیاسی عنصر' کافی کم اور نفسیاتی و جنسی رجحان حاوی تھا۔ شاید اسی لیے 'چمرا سُر' کی طرح اس میں تقریریں اور صحافتی طرز بیان نہ ہونے کے برابر تھا جس کی وجہ سے جو شدید تاثر ندی میں پیدا ہو گیا تھا زیر تبصرہ ناول اس سطح پر 'متاثر کن' نہیں ہو سکا، لیکن یہ ناول 'سنگھاردان' والے شموئل احمد کا ہے اس لیے اپنی تمام تر فروگذاشتوں کے باوصف قاری سے خود کو پڑھوا لینے پر قادر ہے۔ ناول کے 'مواد' کے سلسلے میں سوال کی گنجائش اس

لیے بہت کم ہے کیونکہ مصنف سوار کے تمام پہلوؤں سے کماحقہٗ واقف اور بیان پر تخلیقی قدر رکھتا ہے۔ شموئل احمد اردو فکشن کی تاریخ کا ایک ناقابل تنسیخ نام ہے اور قاری ان سے زیر تبصرہ ناول سے زیادہ بہتر کی توقع میں حق بجانب ہے۔

کتاب میں املا، مذکر و مؤنث اور واحد و جمع کی بہت زیادہ اغلاط ہیں جنھیں بہرحال دور کیا جانا چاہیے۔ تاہم کیونکہ یہ ناول ایک ایسے ناول نگار کے قلم سے نکلا ہے جس کی شناخت ادب میں نہ صرف قائم بلکہ مستحکم ہے اس لیے ظاہری فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ ناول بھی ان کے دیگر ناولوں کی طرح ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

تبصرہ نگار: انجم عثمانی
C-22، فلیٹ نمبر 3، سیکنڈ فلور، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
موبائل: 9873187237

سیرِ ملکِ اودھ

مقدمہ، حواشی و فرہنگ نویس: ڈاکٹر مظہر احمد
صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۲۵۰/روپے
ناشر: ایم۔آر پبلی کیشنز، میٹرو پول مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

اردو میں سفرناموں کو کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور کچھ لوگ تو سفرنامے لکھنے کے لیے اس قدر بدنام ہوئے کہ سفرنامے کو اکثر ناقدین و محققین نے تفریحی ادب کے زمرے میں شامل کر کے تقریباً فراموش ہی کر دیا اور یہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہوا، کیونکہ زیادہ تر اردو سفرنامہ عامیانہ زبان، معمولی درجے کی تخلیقیت اور سطحی قسم کی عجلت پسندی کی پیداوار ہی نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ مصنّفین نے سفرناموں کو ذاتی تشہیر اور نام ونمود کے لیے بھی استعمال کیا۔

تاہم اردو میں چند سفرنامے ایسے بھی لکھے گئے جو واقعی ادبی زبان و بیان سے آراستہ ہیں اور ایک سماجیاتی دستاویز کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ اردو کے اوّلین سفرنامہ نگار یوسف خاں کمبل پوش، باشندہ اودھ کے دونوں سفرنامے اسی سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔ ان کا اوّلین سرنامہ بعنوان ''عجائباتِ فرہنگ' یا 'تاریخ یوسفی' ۱۸۲۷ء میں مطبع دلّی کالج سے شائع ہوا تھا اور دوسرا نسبتاً مختصر سفرنامہ بعنوان 'سیرِ ملکِ اودھ' مخطوطہ کی شکل میں بودلین لائبریری آکسفورڈ یونیورسٹی میں موجود تھا۔ جہاں سے معروف پاکستانی اسکالر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس کو برآمد کر کے لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (L.U.M.S.) کے مجلّے 'بنیاد' میں شائع کر کے اُردو ناقدین و محققین کے لیے بڑا کارِ خیر کیا۔

دہلی یونیورسٹی کے استاد نقاد اور محقق ڈاکٹر مظہر احمد نے ۲۰۱۲ء میں یوسف خاں کمبل پوش کے پہلے سفرنامے کا مستند متن شائع کیا تھا اور زیر تبصرہ کتاب 'سیر ملک اودھ' اسی سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس سلسلے میں بوجوہ ان کو 'سیرِ ملک اودھ' کا اصل مسودہ یا اس کا عکس تو دستیاب نہیں ہوسکا۔ تاہم انہوں نے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے شائع شدہ متن (۲۰۱۷ء) کو بنیاد بنا کر اس پر حواشی، فرہنگ اور مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر نجیبہ عارف کے پیش کردہ متن کے تعلق سے 'سیر ملک اودھ' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کے سرسری مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوفہ سے کہیں کہیں قرأت میں کوتاہی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے نقصِ مضمون اور مطالب گنجلک ہوگئے ہیں۔ نیز حواشی میں بھی ایک آدھ جگہ غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ آج کے کم سوار قارئین کے مطابق فرہنگ میں بھی اضافے کی گنجائش نظر آئی۔ چنانچہ طے کیا کہ ایک ہندوستانی ایڈیشن تیار کیا جائے۔ جس میں محترمہ نجیبہ عارف کی تدوینی کاوشوں کی داد دیتے ہوئے نہایت ادب کے ساتھ ان کی چند کوتاہیوں کی طرف بھی اشارے کیے جائیں۔''

سفرنامہ 'سیرِ ملکِ اودھ' دراصل پچانوے (۹۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ باقی سو سے زائد صفحات کی تقسیم مرتبِ کتاب ڈاکٹر مظہر احمد نے اس طور پر کی ہے۔

(الف) مقدمہ: ۴۴ صفحات (ب) عربی فارسی اشعار فقروں کے مفاہیم: ۱۰ صفحات (ج) حواشی: ۱۰ صفحات (د) اہم فوٹوگراف: ۸ صفحات (ہ) لارڈ ہارڈنگ اور واجد علی شاہ کی ملاقات: ۵ صفحات (و) لارڈ ہارڈنگ کی لکھنؤ آمد: ۴ صفحات (ز) فرہنگ مشکل الفاظ: ۱۵ صفحات

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر مظہر احمد نے 'سیر ملکِ اودھ' کی ازسرِ نو ترتیب میں خاصی محنت سے کام لیا ہے جو ایک ایماندار محقق سے متوقع بھی ہے اور جس کے نمونے ہم ان کے مرتبہ 'عجائباتِ فرنگ' کے جدید ایڈیشن میں دیکھ بھی چکے ہیں۔

یہاں ایک سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جب کہ سفرناموں کا سیلاب سا آیا ہوا ہے اور ہر کس و ناکس سفرنامہ/ نامے لکھ کر زمرۂ ادبا میں داخل ہو رہا ہے۔ مظہر احمد کے اس کام کی ازسرِ نو ترتیب کی ادبی اہمیت کیا ہے؟

اس سوال کے دو جوابات ممکن، بلکہ مستند ہیں۔ اوّل یہ کہ آج جب کہ ہندو پاک کے درمیان ہر قسم کے روابط تقریباً مسدود ہیں۔ مظہر احمد نے ایک پرانے متن کو ہندوستانی قارئین تک پہنچا کر لٹریچر کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ دوم یہ کہ اس سفرنامے کی حیثیت صرف ادبی نہیں، سیاسی و سماجیاتی زیادہ ہے یعنی 'سیر ملک اودھ' کا مطالعہ کر کے اُنیسویں صدی کے

اودھ کی نوابی چمک دمک کے پس پردہ چھپی ہوئی بدحالی، عوامی افلاس اور بدنظمی کے جو مرقعے فراہم ہوئے ہیں۔ وہ بڑے عبرت ناک ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز وائسرائے کے ہاتھوں واجد علی شاہ کا بڑی چالاکی سے بے عزت کیا جانا، ایک تلخ مگر جائز حقیقت نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کی چمک دمک کے بالمقابل اُناؤ شہر کی خستہ حالی ظاہر کرتی ہے کہ اودھ کے عوام بدحالی اور نامرادزندگی بسر کرتے تھے، جب کہ امرا و نوابین ہیرے جواہرات سے لدے پھدے رہتے تھے۔ اسی طرح ایک مقام پر ایک تباہ شدہ گاؤں کی دردناک تصویر پیش کی گئی ہے جس کو چور ڈاکوؤں نے تاراج کر دیا ہے اور اُن کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ نوابینِ اودھ نے فوج کو بھی لوٹ کھسوٹ کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ چنانچہ سرکاری فوج اور ڈاکوؤں میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں کے زیر کنٹرول شہر کان پور ہے، جہاں خوش انتظامی، قاعدہ قانون اور امن و امان قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ کیونکہ کمپنی کا انتظامیہ نوابوں اور راجاؤں کی آمریت سے بدرجہا بہتر تھا۔ اسی بنا پر لارڈ ہارڈنگ نے واجد علی شاہ کو اودھ کا انتظام درست کرنے کے لیے دو برس کی مہلت دی تھی اور جب اودھ کی سلطنت رقص وسرود سے باہر نہ نکل سکی تو ۱۸۵۶ء میں کمپنی کی افواج نے نواب کو ملک بدر کر کے اودھ کے علاقے پر بغیر مزاحمت قبضہ کر لیا تھا، جس پر جان صاحب نے یہ بدنام مگر بامعنی شعر کہا تھا:

ماتھا دُکھا نہ خون بہا ناف ٹل گئی
ایّام کی خرابی سے گدّی نکل گئی

اس نوعیت کے بہت قیمتی واقعات وحادثات اس سفرنامے میں درج کیے ہیں اور اس کو مرتب کر کے ڈاکٹر مظہر احمد نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ سفرنامہ ایک وقت بیک ادب پارہ بھی ہے اور ایک سماجی دستاویز بھی۔

تبصرہ نگار: خالد اشرف
کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، موبائل: 8800489012

علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: ۹۵، قیمت: ۱۸۰/روپے
ناشر: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

لیجیے! شبلیات کے سلسلے کی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی ایک اور تالیف پیش خدمت ہے 'علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں' جس میں مشاہیر کے انتقال و رحلت کے موقع پر علامہ کی منتخب اور سبق آموز تعزیتی اور وفیاتی تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی اردو تحقیق وتنقید بالخصوص ماہر شبلیات کی حیثیت سے کشاں کشاں اپنا نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ عالم یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی سے متعلق کچھ بھی تحریر کرتے وقت ڈاکٹر موصوف کی رائے اور مشورہ، نہ صرف لازمی ہوتا ہے بلکہ مفید بھی ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو سند کا درجہ بھی حاصل ہے۔ یہ بات تعریفاً نہیں، اعترافاً اور مسلمہ حقائق کی روشنی میں کہی جا رہی ہے۔

یہ سچ بھی اور مبنی بر صداقت بھی چوں کہ ڈاکٹر اعظمی اس سے قبل بھی شبلی اور متعلقات شبلی کے باب میں متعدد کتب ورسائل تحریر کر کے قابل قدر اضافے کر چکے ہیں۔ جن کی اپنے اپنے مقام پر خصوصی اہمیت وضرورت ہے۔ ان کتب میں 'متعلقات شبلی'، 'مکتوبات شبلی'، 'شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'، 'شبلی شناسی کے سو سال'، 'اقبال اور دبستان شبلی'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'شبلی خود نوشتوں میں' اور 'شبلی دیباچوں میں' (زیر طبع) خصوصی اہمیت و مقام کی حامل ہیں۔ ان کا مطالعہ جہاں جہات شبلی اور شناخت وتفہیم شبلی کے متعدد گوشوں سے نقاب اٹھاتا ہے وہیں عظمت شبلی کے امکانات بھی ثابت کرتا چلا جاتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب یعنی 'علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں.... علامہ شبلی کے سیکڑوں وفیاتی وتعزیتی تحریروں میں سے منتخب کردہ ۲۶ تحریروں پر مشتمل ہے۔ کمال یہ ہے کہ ان تحریروں کو ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، الندوہ، مکاتیب شبلی اور ملک بھر کے دیگر اہم رسائل و جرائد سے منتخب کیا ہے، اس کا اندازہ ان حوالوں سے ہوتا ہے جو خط/ تحریر کے اختتام پر درج کیے گئے ہیں۔ یہ بذات خود ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔

یہ تحریریں جن مشاہیر واساطین کے اردو کے سانحاتِ فاجعات پر رقم کی گئیں ان میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، نواب محسن الملک، منشی ذکاء اللہ، والدہ عطیہ فیضی، حضور نظام (میر محبوب علی خاں) قاضی محمد سلیم، شاہ امانت اللہ غازی پوری، حادثہ پا، نواب عبدالشکور خاں اور علامہ کے متعدد احباب کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

کتاب کی ابتدا میں مابعد تصویر شبلی اور دیباچہ..... 'علامہ شبلی پر ایک نظر' تحقیقی مضمون کے ذریعے علامہ شبلی نعمانی کی مختصر سوانح، علمی وادبی خدمات، علی گڑھ تحریک ومشن سرسید احمد خاں سے وابستگی وعلاحیدگی کے قصے، حضور نظام آف حیدرآباد کے دربار سے وابستگی ورجعت، فکر ندوہ کو شرمندۂ تعبیر کرنا، پھر دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کی بنیاد وتشکیل کے مراحل، اسی طرح تنقید و تحقیق اور سیر وسوانح نگاری میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین، جیسے اہم موضوعات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ جس سے علامہ شبلی نعمانی کی مجموعی حیات اور جملہ خدمات، قارئین کے سامنے آجاتی ہیں۔ انداز بیاں اور اسلوب نگارش عالمانہ وبصیرت افروز ہے۔ حسب موقع، واقعات کی تصحیح و

توثیق کی غرض سے باحوالہ گفتگو سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ یوں بیان شبلی اور مدح شبلی کا آغاز دیباچے سے ہی ہوجاتا ہے، جہاں شبلی کی حزنیہ تحریروں اور ان کی تاثیر سے متعلق اظہار ملتا ہے۔ یوں دیباچہ بھی جزوِ کتاب بن کر سرنامے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

تعزیتی تحریریں اکثر مختصر ہیں اور چند ایک طویل بھی ہیں۔ لاحاصل اور مہمل معانی ومطالب بھی کہیں کہیں تحریر کی ثقالت کا باعث بنتے ہیں اور کہیں کہیں ان کا غیر ضروری ہونا بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ تاہم من جانب مولف موصوف، ہر تحریر میں تعلیقات وحواشی پیش کیے گئے ہیں جس سے تحریر کا اعتبار دو چند ہوجاتا ہے اور دیدہ و نادیدہ خامیاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ معاً تحریرات شبلی کا اپنا جلوہ ہے، اپنا سحر ہے اور اپنا وجود جو اپنی اہمیت و افادیت تسلیم ہی کرالیتا ہے۔ خطوط وتحریرات کے خاتمے کے بعد تاریخی اشاریہ بھی پیش کیا گیا ہے جس کی ترتیب حسب ذیل ہے: اشخاص/ کتب ورسائل/ مقامات

اوران کی ترتیب متداول ہے یعنی بہ اعتبار حروف تہجی۔ نیز آخر کتاب میں ان کتابیات کی فہرست بھی درج کی گئی ہے جو اس انتخاب کے معرض وجود میں آتے وقت، معاون ومفید ثابت ہوئیں۔ قصہ مختصر یہ کہ کتاب کا اختصار ایجاز وطوالت کے ہم پلہ ہے۔ اس طرح کتاب ہذا جہاں علمائے ادب اور علوم شبلی سے مناسبت رکھنے والے افراد کے پرسنل شیلف میں رکھنے جانے کے قابل ہے وہیں طلبا ومباحثین پر فکر وتحقیق اور تحقیق ونظر کے طریقِ کار کے بھی در وا کرتی ہے نیز اس کی افادیت یوں بھی ہے کہ بطور رہ نما، انھیں تحقیق وریسرچ کے نئے انداز وطریقے سکھلاتی ہے۔

امید ہے کہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی سابقہ کتب کی مانند یہ پیش کش بھی اپنے اور مؤلف کے حصے کی مقبولیت قارئین سے وصول کرے گی اور باب شبلیات میں ایک زندہ کارنامہ ثابت ہوگی۔

تبصرہ نگار: عمران عاکف خان
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

نوائے خاموش

مصنف: معصوم مرادآبادی
صفحات: ۱۹۲، قیمت: ۲۰۰/روپے
ناشر: ایم۔آر۔پبلی کیشنز

معصوم مرادآبادی نے پیش لفظ میں لکھا:

''نوائے خاموش ہمارے عہد کے ان اہم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کا تذکرہ ہے جو گزشتہ عرصے میں ہم سے جدا ہوگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے صلے اور ستائش کی پروا کیے بغیر اپنا علمی، ادبی اور فنی سفر جاری رکھا۔ زیر نظر مضامین ان ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو خراج عقیدت کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ان سرکردہ شخصیات کی ادبی اور فنی خدمات کے تذکرے کے علاوہ ان کے شخصی محاسن کو بھی احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔

گزشتہ عرصے میں ایسے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی ایک پوری صف ہمیں داغ مفارقت دے گئی جس نے طویل عرصہ تک اپنے مداحوں کے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور علم وفضل سے ہمارے شعری اور ادبی سرمائے کو مالا مال کیا۔ جیسے جیسے پرانے چراغ بجھتے جارہے ہیں، ویسے ویسے ہمارے شعری، ادبی محاذ پر تاریکی بڑھتی چلی جارہی ہے!''

اردو ادب کے منظر نامہ پر نظر ڈالنے سے معصوم مرادآبادی کی یہ سطریں اس سچ کو اجاگر کررہی ہیں جو ہمارے عہد میں زہر کی طرح گھل گیا ہے۔ پرانے لکھنے والے اپنی عمریں پوری کرکے ملک عدم کو سدھارتے جارہے ہیں اور نئے لکھنے والوں کا (اب پڑھنے والوں کا بھی) ایسا کال پڑ گیا ہے کہ دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اردو کی کتابیں جتنی تعداد میں اس وقت چھپ رہی ہیں، شاید کسی اور دور میں چھپی ہوں۔ معلوم نہیں کوئی پڑھتا بھی ہے یا نہیں یا ڈرائنگ روم میں سجا کر دکھاوے کے عمل کو فروغ دیا جارہا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں معصوم مرادآبادی کی ایک کتاب ''کیا ہوئے وہ لوگ'' آئی تھی۔

جن لوگوں نے وہ کتاب دیکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھی بھی ہوگی تو انہیں یاد ہوگا کہ ان کی تحریر میں کھوئے ہوؤں کا ایک عجیب سا کرب پیوست تھا۔ معصوم نے تب بھی اور اب بھی ہر شخصیت کے ان پہلوؤں کے ان رنگوں کو ہی کاغذ پر بکھیرا ہے جو ہم سب کے لیے دلچسپی کا باعث ٹھہرے۔ آنکھوں کو بھلا لگے، ان کے قلم میں وہ تاثیر ہے کہ ان کی تحریر کو آپ نہ بیچ سے چھوڑ سکتے ہیں نہ کاغذ موڑ سکتے ہیں۔ ایک طرح کا کھلا پن، ایک دلکشی اور ایک ایسا لفظیاتی نشہ جواب کم از کم دیکھنے میں آرہا ہے۔ کہیں کہیں سے ان کی تحریر کی دلکشی اور سچائی کے عکس دیکھتے چلئے!

> ''مے کشی جون ایلیا کی ایسی کمزوری تھی جس نے ان کی صحت کے علاوہ ان کی زندگی کی بہت سی خوشیاں اور خود ان کا اپنا قرار چھین لیا تھا۔ موت سے قبل ان کا ایک پھیپھڑا بالکل ناکارہ ہوگیا تھا اور دوسرا پھیپھڑا ۸۰ فیصد ضائع ہوچکا تھا۔'' (ص: ۳۰)

بیکل اتساہی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۸۶ء میں جب انہیں ایوان بالا راجیہ سبھا کا ممبر چنا گیا تو یہاں بھی انھوں نے اپنی شعر وشاعری کا سکہ جمایا۔ غیر اردو داں

حلقوں میں ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی عام فہم ہندوستانی زبان پر دسترس تھی۔'' (ص:۴۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اس پُر آشوب دور میں فہمیدہ ریاض نے اپنے ترقی پسند نظریات اور سیاسی نظریات کے سبب بے شمار چیلنجوں کا مقابلہ کیا۔ضیاء الحق کے دور آمریت میں ان پر کم وبیش دس مقدمات چلائے گئے۔حالات کا جبر اتنا سخت تھا کہ فہمیدہ ریاض نے جلاوطنی کو فوقیت دی اور وہ اپنے دو چھوٹے بچوں اور ایک بہن کے ساتھ ہندوستان آ گئیں۔'' (ص:۶۰)

(فہمیدہ ریاض کی کتابوں کے بارے میں ایک ضروری وضاحت درج کئے دیتا ہوں جس سے غلط فہمی آگے پھیلنے سے رک جائے !ان کا ناول ''گودا وری''، شکیل صدیقی کے ترجمے کے ساتھ ہندی میں بھی سارانش پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا تھا۔معصوم صاحب نے ''خطِ مرموز'' کو سہواً ناول لکھ دیا ہے۔''خطِ مرموز'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ''کھلے دریچے سے'' فروغ فرخ زاد کی نظموں کے ترجمہ پر مبنی اور ''کراچی کی کہانی'' ان کا ناول نہیں بلکہ کراچی کے خونچکاں حالات پر ایک لکھنے والے کی لرزہ خیز تحریر ہے جو ''آج'' کراچی کے ''کراچی کی کہانی'' نامی خصوصی شمارے کے حصہ دوم میں ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ان کا ایک اور ناول ''زندہ بہار'' ایک سفرنامہ ایک ناول کی پیشانی کی تحریر کے ساتھ ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا تھا)

فہمیدہ ریاض پر معصوم کی یہ تحریر ان کی زندگی کے ان عوامل کو بھی سامنے لاتی ہے جو ہم ایسے دور بیٹھے لوگوں کے علم میں نہیں آ پائے۔

ڈاکٹر محمد حسن پر ان کی تحریر ایک ایسے دکھ کی جھلکیاں پیش کرتی ہے جو تعلیم حاصل کر لینے کے بعد یا کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جانے سے مذہب بیزاری کا لبادہ اوڑھ لینے سے نمایاں ہوتی ہے۔

فضیل جعفری، کلدیپ نیر، ابن صفی، خواجہ احمد عباس، یونس دہلوی، محبوب الرحمٰن فاروقی، ایم ایف حسین، مشتاق احمد یوسفی، ملک زادہ منظور، جی ڈی چندن، ایک ستاروں بھرا تھال ہے جو نظروں کو خیرہ کر رہا ہے۔کس کس کا ذکر کیا جائے۔یہ وہ لوگ تھے جو محفل میں ہوتے تھے تو گلاب سے مہکتے تھے اور کاغذ پر ہوتے تھے تو ان کے لفظوں کے چراغ ایسی روشنی چھوڑ جاتے تھے جن سے آنے والے زمانے کے لوگوں کو بھی راستہ تلاش کرنے میں کسی اندھیرے کا سامنا نہ کرنا پڑے گا!

معصوم مرادآبادی کی ان تحریروں میں سچ ہے۔واقعات کے وہ چہرے ہیں جن پر باریک سا بھی پردہ یا نقاب نہیں۔یہ خاکے کی ایک نئی صورت پیش کرنے والی تحریریں معلوم نہیں آج کتنی پسند کی جائیں گی، لیکن کل ان پر جب کچھ دنوں کی دھول جم جائے گی تب پڑھنے والے اس طرز تحریر، لفظوں کی نشست برخاست اور کہنے کے انداز کو جی بھر کر سراہیں گے' کیونکہ یہ ذہنی تربیتیں، زندگی کی بھاگم بھاگ میں اب کھوتی جا رہی ہیں۔

تبصرہ نگار: مرغوب علی

49، دھرم داس، نجیب آباد (یوپی)، موبائل: 8077360604

زمین سے بچھڑے لوگ

مصنف: تنویر احمد تماپوری

صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۲۵۰/روپے

ناشر: ایم۔ایم پبلی کیشنز، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی

تنویر احمد تماپوری اردو کے ایک باذوق قاری اور اس کے سچے عاشق ہیں۔وہ اردو کی ادبی اصناف کو معراجِ کمال پر دیکھنے کے حد درجہ خواہاں ہیں۔تخلیقی ادب کے سنجیدہ قاری ہونے کے ناطے ان کا احساس ہے کہ ان کے اندر بھی ایسے بیج انکورِت ہو گئے ہیں، جن کو پانی دینے سے اردو کے تخلیقی ادب میں وہ بھی کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔تماپور کے فرزند کا یہی خیال اردو کے حق میں بہتر ثابت یوں ہوا کہ چودہ افسانوں پر مشتمل ان کا افسانوی مجموعہ 'زمین سے بچھڑے لوگ' اردو کی ادبی وراثت میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادب کا کام انبساط ولطف اندوزی ہے اور اگر فنی پاسداریوں کے ساتھ اس میں فلسفۂ حیات اور درسِ اخلاق کے عناصر بھی پائے جائیں تو اسے اعلیٰ ادب کہا جائے گا۔اسی کے ساتھ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس اعلیٰ ادب کو پڑھنے کے بعد کسی قاری کے اندر کا خالق بیدار ہو جائے تو اس ادب کو مقبولیت کی بلندی تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ تنویر احمد تماپوری جیسے عام قاری کے دل میں بھی جب خالق کی صف میں داخل ہونے کی کلبلاہٹ ہلّوریں مارنے لگی ہیں تو کسی بھی ادب کے معراج کے لیے اسے فالِ نیک سمجھا جانا چاہیے۔تنویر احمد تماپوری نے اپنے گہرے مشاہدات وتجربات کو افسانوی قالب میں اس فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک نوآموز قلمکار ہیں۔عصری حسیت اور گہری ریاضت ان کے کہنہ مشق ہونے کا اشاریہ کہی جا سکتی ہے۔اس کا کچھ کچھ اندازہ ان کے افسانوں کے تیکھے عناوین سے بھی ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ مجموعے کا پہلا افسانہ 'سوالیہ نشان' ہے۔یہ کیمسٹری کی ایک اعلیٰ اقدار کی حامل استانی کی کہانی ہے، جو اپنی بیٹی کی بے راہ روی سے پریشان ہو کر حواس باختہ ہو بیٹھی تھی۔ذہنی طور سے مضمحل کر دینے والے حالات میں لڑنے کے بجائے خود بے راہ رو ہونے پر کیسے مجبور ہو جاتی ہے اور کیوں اس گندگی میں اتر جاتی ہے، اسی 'سوالیہ نشان' کے اردگرد کہانی بنی گئی ہے۔زبان وبیان کی سطح پر کہانی کو عمدہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی۔آج کی زبان کا

استعمال ہوا ہے اور انگریزی کے سبک الفاظ کے برمحل استعمال نے کہانی کی زبان کو دوآتشہ بنا دیا ہے۔

'لٹکتی تلوار' بالی ووڈ کے پسِ منظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ اس میں ایک عام آدمی کے خاص بننے سے لے کر اس کے بے غیرت بننے تک کے سفر کو لفظوں کی باریک چھڑی کے وار سے ایک کالے سچ کی طرح دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کہانی فلمی دنیا کی ظاہری چکاچوند کے پیچھے چلنے والی رسہ کشی، سیاست اور جنسی بے راہ روی کی منہ بولتی تصویر ہے۔

'کیمیا گر' میں ضمیر واحد متکلم کے بیانئے میں خلیج کی ترقی کے راز کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کہانی کو منظر نگاری کے ایک اعلیٰ اور عمدہ نمونے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ حالانکہ تنویر احمد تماپوری نے جو پیغام دینے کی کوشش کی ہے، اس کی ترسیل قاری تک ہوتی تو ہے، لیکن ذرا مدھم انداز میں۔ ان کا خیال ہے کہ خلیج کی ترقی اور چکاچوند دراصل ان مزدوروں کے سبب سے ہے جو وہاں دن رات کام کر رہے ہیں۔ تنویر احمد نے اس خیال کو نادرست قرار دیا ہے کہ وہاں کی چکاچوند کا سبب قدرتی وسائل کی فراوانی یا قیادت کی دوراندیشی ہے۔

'زمین سے بچھڑے لوگ' ٹائٹل افسانہ ہے اور رمزیاتی بھی۔ چھبیسویں صدی کی دوسری دہائی کا انسان مشینوں اور آلات و وسائل پر کس قدر منحصر ہو سکتا ہے اس کی قیاس آرائی کی گئی ہے۔ یہ ایک سائنس فکشن ہے۔ اردو ادب میں سائنس کو لے کر کام کم ہی ہوا ہے اس لیے بھی اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ کیا کبھی سوچا گیا ہے کہ ان مشینوں اور آلات سے رشتہ ٹوٹ جائے تو انسان کہاں جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اسی بابت غور و فکر کی دعوت دیتا یہ افسانہ مجموعے کا سب سے اہم افسانہ ہے۔ آج کا انسان اس زمین سے اپنے تعلق کو بھول چکا ہے جس کے ایک ایک ذرے سے اس کا مستقبل وابستہ ہے۔

'ریت کا پل' مسلکی عناد پرستی کے بیچ ایمان و اخلاص کا دکھاوا کرنے والے لوگوں کی اصلیت کو ظاہر کرنے والی کہانی ہے۔ مجاہد نام کے ایک سعودی ریٹرن کردار کے دوہرے اعمال کی نقاب کشائی کی گئی ہے، جس میں وہ افطار کی دعوت میں شریک ہونے سے اس لیے انکار کر دیتا ہے کہ مغرب کی نماز اس کی ترجیحی مسجد میں نہ ہو پائے گی، لیکن وہی شخص بجلی کی چوری کے لیے کئی حربے استعمال کرتا ہے۔ اس کے باوجود اسے احساس گناہ نہیں۔ کہانی کو ۱۸۰ ڈگری کا موڑ دے کر اختتام تک پہنچانے کا انداز قابل تعریف ہے۔ کٹھور لہجے اور اجنبی اسلوب کی یہ کہانی اس کتاب کی ایک اہم کہانی مانی جائے گی۔

'رشتوں کی صلیب' خلیج میں مالی فراوانی اور جنسی بے راہ روی کے شکار لوگوں کی نفسیات بیان کرتی ہے۔ دو نوعمر لڑکیوں کی شادیوں میں آنے والی رکاوٹ، دونوں لڑکیوں کو رشتوں کی صلیب پر چڑھائے جانے کی کہانی پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی کا ڈِکشن دل موہ لینے والا ہے، اختتام تک قاری قیاس آرائیوں میں مشغول رہتا ہے اور اس کے سحر میں خود کو گرفتار محسوس کرتا ہے۔

'ہوم ورک' موجودہ سیاست کی پینترے بازیوں اور بم دھماکوں کے بیچ گئو کشی کے نام پر دنگے بھڑکا کر کرسی حاصل کرنے کی کہانی ہے۔ کہانی ملک کی سیاست پر گہرے مشاہدات کا پرتو ہے۔ قاری کسی بھی سیاسی رہنما پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ جس باریکی اور جس زبان و بیان میں سفید پوشوں کی ان حکمت عملیوں (ہوم ورک) کو واضح کیا گیا ہے وہ قاری کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

'گاندھی کا چوتھا بندر' ممبئی کے ماحول، انڈر ورلڈ اور 'کوٹھے' کے بیچ کے گٹھ جوڑ کے گرد لکھی گئی کہانی ہے۔ اس موضوع پر اور بھی افسانے لکھے گئے ہیں اور کامیاب بھی ہیں، لیکن تنویر تماپوری کا یہ افسانہ اس لیے منفرد ہے کہ اس میں فکر کا جداگانہ رخ ہے اور تشبیہات کا استعمال بھی تخلیقی ہنرمندی پر دلالت کرتا ہے۔

'نگہبان' کنکریٹ کے جنگلوں کے بیچ شخصی لالچوں کی وجہ سے وقوع پذیر حادثوں کے درمیان جان بچانے کے لیے کس طرح کوئی شخص احترامِ آدمیت کی آخری حدود کو بھی پھلانگ دیتا ہے۔ اسی دردناک تصویر کو کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔ منظر نگاری سے لے کر انسانی نفسیات کے پراثر بیان تک، ہر زاویے سے قاری کا دل و دماغ متاثر ہوتا ہے۔

'وہ لمحے' خودنوشت کے پیرائے میں ماں اور بیوی کو فون کرنے کی فریکوئنسی کو لے کر ایک بیمار ماں کے تاثرات کو بیان کرتی کہانی ہے۔ کہانی کے اختتام تک ماں سے محبت کرنے والے ہر مہاجر قاری کی آنکھ سے یا تو آنسو ٹپکے گا یا پھر ماں سے بات کرنے کے لیے موبائل فون پر ہاتھ جائے گا۔

اسی طرح 'اینٹی وائرس' اور 'رئیس' بھی قابل مطالعہ افسانے ہیں۔ 'ادھیکاری' مجموعے میں شامل واحد افسانچہ ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کو لطف اندوز ہوئے بغیر رہتا۔

اس خوبصورت کتاب کو اردو افسانے کا قاری نہ صرف پڑھے گا بلکہ سنبھال کر رکھنا بھی چاہے گا۔ ممکن ہے تنویر احمد تماپوری کو نظر ثانی اور سکنڈ ایڈیشن کے لیے کمربستہ ہونا پڑے۔ یقین ہے کہ افسانوی ادب سے محبت کرنے والے اس کتاب کا استقبال کریں گے۔

تبصرہ نگار: شاہد حبیب
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، 504/122 نزد ندوہ کالج
لکھنؤ۔226020، موبائل: 8539054888

◆◆◆